فصل چہارم
علی جاہ عزت بیگووچ

1925ء کو پیدا ہونے والے علی جاہ عزت بیگووچ سے دنیا 1990ء میں صدرِ جمہوریہ بوسنیا ہرزگونیا کی حیثیت سے متعارف ہوئی۔ اگرچہ عزت بیگووچ اس سے قبل بھی تقریباً نصف صدی سے میدان عمل میں موجود تھے مگر دنیا کی نظر میں وہ یوگوسلاویہ کی شکست کے وقت میں آئے۔

انہوں نے مغربی نظام سے کھلی ٹکر لی۔ نیز انہوں نے اس نظام کے خلاف 'بغاوت' کا اعلان اس وقت کیا جب کہ یوگوسلاویہ کے ٹوٹنے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اسی بغاوت کا نتیجہ تھا کہ 1980ء میں سرایبو کی عدالت نے جن بارہ اہل فکر ادیبوں، دانش وروں اور سیاست دانوں کو سخت سزائیں سنا کر زندان خانے میں بھجوایا تھا، علی جاہ عزت بیگووچ ان میں شامل تھے۔

سابقہ یوگوسلاویہ کے ٹوٹنے سے اس کے اندر پائی جانے والی جمہوریتوں نے اپنی آزادی اور استقلال کا اعلان کردیا تھا۔ انہی جمہوریتوں میں بوسنیا ہرزگوینا بھی شامل ہے۔ علمی قیادت، سیاسی فراست، دینی سیادت کے حامل جرأت وعزیمت، استقامت اور حوصلے کے پہاڑ علی جاہ عزت بیگووچ اس جمہوریہ کے پہلے صدر ہیں۔ آپ کا دورِ صدارت 1990ء سے 1996ء تک کا ہے۔ اس کے بعد آپ 2000ء تک بوسنیا کے Member of Presidency رہے۔

علی جاہ عزت بیگووچ اپنی رعایا میں بھی مقبول رہے ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بوسنیائی عوام انہیں بوسنیائی زبان میں Dedo کہہ کر پکارتے تھے جس کا مطلب ہے Grandpa یعنی 'بابا'۔

عزت بیگووچ ادیب، صحافی، قانون دان، دانش ور، نقاد اور احیائے اسلام کے علمبردار تھے۔ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں آپ اپنی کتابوں میں انگریزی، سربوکروشیائی، پیانوی، جرمن، عربی اور فرانسیسی کتابوں کے حوالے بکثرت نقل کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ ہر زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی صرف اور صرف اسلام ہی حقیقی علم ہے۔ نیز اسلام ہی امن وسلامتی اور سکون فراہم کرسکتا ہے۔

عزت بیگووچ استدلالی انداز میں اپیل کرتے ہیں جس سے اردو دان طبقہ بالخصوص زیادہ مانوس نہیں۔ دنیا بھر میں آپ کی کتب کے تراجم ہو رہے ہیں۔ آپ کی سب سے مشہور کتاب Islam-Between East and West ہے۔ اس کتاب کو سب سے پہلے امریکن ٹرسٹ پبلی کیشنز نے امریکہ سے انگریزی میں شائع کیا' پھر اس کتاب کا سربوکروشیائی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس کے بعد دیگر زبانوں میں بھی اس کے تراجم شائع ہوئے۔ عزت بیگووچ کی یہ کتاب بلاشبہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں حیاتیات، فزکس، سیاسیات، عمرانیات، مذہب، قانون، تاریخ، تمدن اور معاشیات کے مستند حوالوں کے ساتھ مغربی تہذیب، مغربی افکار، طرز زندگی اور مغربی غلبے پر تنقید کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اسلام کے جامع کردار کو ثابت کیا گیا ہے۔

آپ کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں لیکن وہ بالخصوص تین پہلوؤں سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

1۔ مسلمانوں کے تشخص کو بحال رکھنے اور کمیونسٹ اقتدار کے دور میں اسلام کو بچانے کے لیے مصروف جہاد رہے۔

2۔ آپ کی عملی سرگرمیوں کے ساتھ ان کا علمی وفکری پہلو بھی روشن نظر آتا ہے۔ یورپ کی تہذیبی یلغار اور ادلتے بدلتے نظریات اور مادہ پرستانہ نظام کے اندر رہتے ہوئے انہوں نے اسلامی فکر کو پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔

3۔ آپ کی شخصیت کا تیسرا پہلو آپ کی قائدانہ صلاحیتیں ہیں۔ آپ اپنے منصب کی صورت میں آفتاب کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔ آپ ایسی جمہوریہ کے صدر رہے ہیں جس پر تین پڑوسی جمہوریتوں نے مل کر حملہ کیا تھا۔ جمہوریہ سربیا ماؤنٹی نیگرو اور جمہوریہ کروشیا۔

علی جاہ عزت بیگووچ کی علمی اور فکری صلاحیتوں اور آپ کی بلند و بالا شخصیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کئی مضامین میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ سپین (Spanish) کے نیوز پیپر نے 1995ء میں Person of the year قرار دیا۔ اس کے علاوہ انہیں سعودی عرب کے حکمران شاہ فیصل کی جانب سے بھی ایوارڈ ملا نیز ایک ایوارڈ 'سینٹر فار ڈیموکریسی واشنگٹن' کی جانب سے بھی ملا۔

19 اکتوبر 2003ء کو یہ مجاہد عالم باعمل، مصنف، مفکر، سیاستدان بالآخر زندگی کے 78 سال گزار کر خالق حقیقی سے جا ملے۔

انسان اور دنیا کی حقیقت

علی جاہ عزت بیگووچ احیائے اسلام کے علمبردار ہیں آپ نے اپنی کتاب 'اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش' میں تہذیب انسانی اور ثقافت اور خاندان کے کردار پر بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''انسان حیاتیاتی تسلسل اور معاشرتی عمل کا نام نہیں ہے' جیسا کہ مادہ پرست خیال کرتے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کا وجود نہ ہوتا تو انسان بھی وجود میں نہ آتے اور اگر انسان وجود میں نہ آتے تو انسانی تہذیب بھی وجود میں نہ آتی اور اگر تہذیب وجود میں نہ آتی تو عام سرگرمیوں کا محور اسباب اور اشیائے ضرورت کی فراہمی تک محدود رہتا (حاجات اور فراہمی اسباب کے سلسلے کا نام ہی تمدن ہے)۔ الحاد اور دہریت اگرچہ سائنس کے دلدادہ اور ترقی کے علمبردار ہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ انسان، انسانیت، آزادی اور انسانی حقوق کے انکار کے علمبردار بھی ہیں۔
>
> تہذیب اور تمدن کے درمیان کشمکش دراصل دماغ اور ضمیر، فطرت اور انسان، یا سائنس اور مذہب کے تصادم کا نام ہے۔ اس بات کو آغاز ہی میں سمجھ لینا بہتر ہے۔ بنیادی طور پر تہذیب مذہب سے اور تمدن الحاد سے تعلق رکھتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سائنس انسانیت کی طرف راہنمائی کی اہل نہیں ہے اور تن تنہا مذہب انسانی ترقی کی طرف پیش قدمی کر نہیں سکتا۔''[1]

ایک اور جگہ پر اسی بات کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

۱۔ بیگووچ، علیجاہ عزت، اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۲۶

''انسان کے وجود کے ظہور سے ہی دو متضاد حقائق اس کے ساتھ رہے ہیں ایک حقیقت کا نام ذرائعِ معاش ہے اور دوسری کا نام عبادت کا طریقہ ہے''۔[۲]

تہذیب وتمدن سے مراد

اسی سلسلے میں اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

تہذیب سے مراد مذہب کے انسان پر اثرات یا انسان کے اپنی ذات پر اثرات ہوتے ہیں جبکہ تمدن سے مراد فطرت پر انسانی ذہانت کے اثرات اور بیرونی دنیا پر اس کی کارکردگی کے اثرات ہیں۔تہذیب کا مطلب ہے 'انسان ہونے کا فن' تمدن سے مراد 'سرگرم رہنے، حکومت کرنے اور چیزوں کو مکمل بنانے کا فن' ہے۔تمدن تو زمانے کے لحاظ سے ہمہ وقتی تبدیل ہونے کے عمل کا نام ہے۔تمدن دراصل انسانیت بمقابلہ اشیا (Chosism) ہے۔[۳]

موجودہ تہذیب وتمدن کے چیلنجز

مادے پر انسان کا انحصار مستقل بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ایک سروے کے مطابق امریکی مرد، عورت اور بچے مختلف قسم کا اٹھارہ ٹن سامان سالانہ استعمال کرتے ہیں۔اس وجہ سے نئی نئی ضروریات پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں اور محروم لوگوں کی محرومیوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔تمدن انسان اور فطرت کے درمیان مادی تبادلے کو مزید سے مزید تر کر دیتا ہے۔ ظاہری اور بیرونی زندگی کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھاتا ہے اور اس طرح اندر کی زندگی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔تہذیب کو سمجھنے کے ساتھ ہی مصنف موجودہ تہذیب وتمدن کے چیلنجز یوں بیان کرتے ہیں:

مصنوعات سے منافع حاصل کرو اور پھر اس منافع کو فضول خرچی میں استعمال کرو۔موجودہ تمدن کا یہ اصل الاصول ہے۔اس کے برعکس تہذیب (اپنی مذہبی نوعیت کے حساب سے) انسانی ضروریات کو کم سے کم تر کرتی ہے یا ان کی فراہمی پر حد مقرر کر دیتی ہے اور اس طرح انسان کو ایک حد میں رکھ کر انسانی مرتبے پر فائز کرتی ہے۔[۴]

موجودہ تہذیب اور تعلیم

مغرب میں جس دور کو نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جاتا ہے، علی عزت بیگووچ اسی دور کو دورِ زوال سے تعبیر کرتے ہیں۔اس لیے کہ ان کی نظر میں اخلاقیات سے عاری ترقی دراصل ترقی نہیں بلکہ پرلے درجے کا تنزل ہے۔وہ لکھتے ہیں:

1350ء سے 1550ء تک کا زمانہ دورِ نشاۃ ثانیہ کہلاتا ہے اور اس انقلاب کی اکثر کامیابیاں اسی دور میں دریا برد ہو گئیں۔نشاۃ ثانیہ نے نسل انسانی کے اجتماعی مسائل کو نظر انداز کر کے فرد کو زیادہ اہمیت دی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ نشاۃ ثانیہ حقیقت سے کاملاً نابلد ہے۔مغربی تہذیب کے عظیم الشان فنون لطیفہ بے

۲۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۹۷

۳۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۹۹

۴۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش ص: ۱۰۰، ۱۰۱

شک اسی دور میں تخلیق ہوئے لیکن مجموعی طور پر اعلیٰ انسانی قدروں کا زوال شروع ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سی یورپی ریاستوں میں آبادی میں کمی واقع ہونا شروع ہوگئی۔۵

تکنیکی تعلیم:

علم انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہوتا ہے اور اصل علم وہ جو انسانیت کے کام آئے۔ جس تعلیم میں روحانی اور اخلاقی پہلو کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا، اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تمدن کے حوالے سے تکنیکی تعلیم سبب اور نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس قسم کی تعلیم فرد کو معاشرے کے لیے تیار کرتی ہے اور اس کے دیگر تمام پہلو اس پیمانے پر ناپے جاتے ہیں۔ اس تعلیم کی تکمیل اسی پر ہوتی ہے کہ انسان عناصر فطرت پر غلبہ حاصل کرلے۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ جو تعلیم دی جاتی ہے اس کا آغاز اور اختتام انسان پر ہوتا ہے اعلیٰ انسانی قدروں پر نہیں۔۶

تعلیمی میدان میں مزید ترقی کیسے ہوئی اور اس کی نوعیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں مصنف اپنی کتاب میں کچھ یوں لکھتے ہیں:

''تعلیم کے میدان میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی مثال دائرے میں ترقی کی ہے۔ جہاں ترقی کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ مثلاً 1900ء میں امریکہ میں چوبیس ہزار پروفیسر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ 1920ء میں ان کی تعداد 50 ہزار ہوگئی جبکہ اس صدی کے آخر میں یہ تعداد (پچاس ہزار سے) چار لاکھ اسی ہزار تک پہنچ جائے گی۔ اس طرح امریکہ میں 1900ء میں تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد دو لاکھ اڑتیس ہزار تھی۔ 1959ء میں سینتیس لاکھ ستر ہزار اور 1992ء میں یہ تعداد ایک کروڑ چھیالیس لاکھ تک پہنچ گئی۔ 1900ء میں تعلیم پر امریکی حکومت مجموعی طور پر 27 کروڑ ڈالر خرچ کرتی تھی۔ 1970ء میں اس رقم کی مقدار ساڑھے بیالیس ارب ڈالر ہوگئی۔۷

معاشرے پر ذرائع ابلاغ کا اثر

ذرائع ابلاغ کے معاشرے پر کیا اثرات ہیں اس کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

جن ذرائع کو ذرائع ابلاغ کا نام دیا گیا ہے وہ دراصل انسانوں کی رائے کو بگاڑنے کے اوزار ہیں یعنی ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگرام اور اخبارات۔ چند افراد ان کو تیار کرتے ہیں، پروگرام لاکھوں افراد دیکھتے ہیں اور لاشعوری طور پر ان کے مطابق ڈھلتے چلے جارہے ہیں۔۸

یہ ایک دوسرا بڑا چیلنج ہے جس کی حقیقت پر مصنف اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

۵۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۱۰۳
۶۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۱۰۸
۷۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۱۰۹
۸۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۱۱۳،۱۱۴

''عوام الناس کی نفسیات اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ وہ باتیں جن کا حقائق اور سچائی سے کوئی بھی تعلق نہ ہو انہیں بار بار دہرانے سے لوگوں کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا جاسکتا ہے۔ ٹیلی ویژن کے پس پردہ یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ انسانوں کے شعور ہی نہیں بلکہ لاشعور پر بھی اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے۔ مخصوص نظریات ناظرین پر اس طرح لادنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ انہیں کسی نوعیت کا پروپیگنڈا نہیں سمجھتے بلکہ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہی ان کی اپنی طے شدہ رائے ہے۔''

اس دور کے منفعت پرست معاشرے ٹیلی ویژن میں اپنے لیے بڑی خبر دیکھتے ہیں اور اس سے بہت ہوشمندی سے کام لیتے ہیں۔ یوں یہ میڈیا انسان کی آزادیِ رائے کے لیے ایک خطرہ بن گیا ہے۔ اس کا غلط استعمال تو پولیس کے غلط رویے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یہ تو حوالات، تھانے، جیل اور تعذیب خانے سے بھی زیادہ نقصان رساں ہے۔ مصنف کہتے ہیں:

''میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم نے اپنی آنے والی نسلوں کی ذہنی نشوونما کو اثر انداز کردیا اور ان کو اپنے طور پر سوچنے کا موقع فراہم نہ کیا تو سنگین جرم کے مرتکب ہوں گے۔ وہ افکار کی تازگی سے محروم ہوں گی اور انہیں اپنی محرومی کا سبب بھی معلوم نہ ہوگا۔''[۹]

میڈیا کا مقصد لوگوں کو ذہنی غلام بنانا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف ذہنی غلامی کی برائی بیان کرتے ہوئے یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''دستور اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ حکمرانوں کے اختیارات کو محدود رکھنا ہے اور اب اس چیز کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ ایسا دستور بنایا جائے کہ جس میں ذہنی غلامی کو روکنے کے لیے اقدامات کیے گئے ہوں کیونکہ ذہنوں کو غلام بنانا جسموں کو غلام بنانے سے بدتر فعل ہے۔''

اس تمدن کے خاص اثرات سے کون سا طبقہ متاثر ہوا ہے۔ مصنف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس خاص تمدن کے اثرات سب سے زیادہ محنت کش طبقے پر مترتب ہوتے ہیں۔ فیکٹریوں میں ہونے والا کام انسان کی شخصیت کو تقریباً ناکارہ بنادیتا ہے۔ ایک ماہر عمرانیات کا کہنا ہے:

''صنعتی کارکن چونکہ سخت نظم وضبط کے پابند ہوتے ہیں اور اپنی تمام صلاحیتوں کو انتظامیہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتے ہیں، نیز انہیں کافی وقت ایک خاص ماحول میں ان چیزوں کے درمیان گزارنا پڑتا ہے جو فیکٹریوں میں تیار ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کی عادات تقریباً مشینی بن جاتی ہیں اور یہ صورت حال سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں معاشروں میں یکساں ہے۔''[۱۰]

مادی ترقی میں انسانیت کا زوال

مادی ترقی کی سلسلے میں مصنف امریکی سائنس دان جولیس رابرٹ اوپن ہائمر امریکی ہائیڈروجن بم کا موجد ہے کا

۹۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۱۱۵، ۱۱۶ ۱۰۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۱۱۹، ۱۲۴

حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انسان نے پچھلے چالیس برسوں میں اس قدر مادی اور تکنیکی ترقی کر لی ہے جتنی کہ اس نے سابقہ 40 صدیوں میں نہیں کی تھی۔ 1900ء سے لے کر 1960ء تک انسان جو فاصلہ طے کر چکا ہے اس کی نسبت 10 سے 40 تک پہنچ چکی ہے۔ درجہ حرارت 5 سے 11 فضائی دباؤ اور 10 سے 16 تک پہنچ گیا ہے۔ تین برسوں میں پرانے پسٹن انجن کی جگہ نیوکلیائی کشتیوں سے چلائے جانے والے ماڈلز لے لیں گے۔ وہ دن قریب آ رہا ہے جب بجلی کی تاریں زیر زمین نہ بچھائی جائیں گی بلکہ برقی گاڑیاں سڑکوں پر دوڑتی نظر آئیں گی۔''[۱۱]

اس ترقی کے خطرناک نتائج سے آگاہی کے لیے مصنف اپنی کتاب میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کی رپورٹ نقل کرتے ہیں:

''اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا کہ چند ترقی یافتہ ممالک کو جرائم کا شدت سے سامنا ہے۔ مادی ترقی کے موجودہ دور میں انسانی زندگی ہر لحاظ سے پرآسائش ہے۔ مختلف قسم کے ذاتی اور گروہی جرائم چوریاں، دھوکے بازیاں، بدعنوانی اور منظّم ڈکیتیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ترقی کے جدید طریقے اپنانے کی سخت قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔''[۱۲]

ایک نئے زبردست چیلنج کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''عریانی اور برہنگی کی بھی بنیادیں ہیں۔ فرانس، ڈنمارک اور مغربی جرمنی جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ مہذب کہتے ہیں۔ عریانی اور برہنگی میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ 1975ء میں فرانسیسی سینما گھروں میں جو فلمیں دکھائی جاتی ہیں ان کا نصف برہنہ فلموں پر مبنی ہوتا ہے۔ صرف پیرس شہر میں 250 سینما گھر ان فحش فلموں کے لیے مخصوص ہیں جو لوگ سدھار چاہتے ہیں وہ اس صورت حال سے پریشان ہیں۔''[۱۳]

موجودہ تہذیب کا ایک بڑا چیلنج صحت کا ہے۔ بیگووچ علی جاہ عزت اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''1968ء میں عالمی ادارہ صحت نے مختلف ممالک کے درمیان خودکشی کی شرح کے تناسب کے گوشوارے جنیوا سے شائع کیے۔ اس فہرست میں پہلی آٹھ پوزیشنیں مغربی جرمنی، آسٹریلیا، کینیڈا، ڈنمارک، فن لینڈ، ہنگری، سوئٹزرلینڈ، سویڈن نے حاصل کیں۔ ان آٹھ ممالک میں اموات کی بڑی وجہ خودکشی ہے۔ جن کی عمر 15 اور 45 سال کے درمیان تھی۔ پہلی وجہ دل کی بیماریاں تھیں۔ دوسری وجہ کینسر کا مرض تھا۔ عالمی ادارۂ صحت کی 1970ء کی رپورٹ میں واضح طور پر کہا گیا کہ یہ سلسلہ صنعتوں میں اضافے، شہری زندگی میں اضافے اور خاندانی نظام کے ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر کسی ایک معاشرے یا ایک قوم میں اس عمل کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ جس قدر تعلیم

۱۱۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۱۲۴

۱۲۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۱۲۷

۱۳۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۱۲۸، ۱۲۹

پھیل رہی ہے اور ترقی ہو رہی ہے۔ یہ مصائب بھی اسی تناسب سے پھیل رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یوگوسلاویہ میں سب سے زیادہ سلووینیہ ترقی یافتہ ہے جہاں شرح تعلیم 98 فیصد ہے۔ لیکن وہاں پر لاکھ میں سے 8 تا 25 افراد خودکشی کرتے ہیں۔ کم ترقی یافتہ کوسوو میں جہاں شرح تعلیم 56 فیصد ہے۔ خودکشی کی شرح 364 فی لاکھ ہیں۔ گویا دونوں جگہ کا تناسب سات نسبت ایک کا ہے۔ یہ صورت حال 1970ء میں تھی۔''[۱۴]

اس صورت حال کی وجہ بیان کرتے ہوئے علی جاہ عزت بیگووچ لکھتے ہیں:

''یہ صورت حال جس کا ساری دنیا کو سامنا ہے۔ اس کی عام وجوہات پر روشنی ڈالنا تو ناممکن ہے' تاہم نوجوانوں میں نشے کے وجوہات کا سلسلہ والدین سے جا ملتا ہے۔ ڈاکٹر ولادتا جوروک' جو کہ یوگوسلاویہ کے ماہر نفسیات ہیں' لکھتے ہیں کہ ''ایک خاندان جو مکمل طور پر تباہ ہوگیا ہو' ایک نوجوان کے دماغ میں ایسے عارضے پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ذہنی دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے حفاظتی طریقوں کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ والد اور والدہ کی تقسیم یا بٹی ہوئی محبت اور خاندانوں کا انتشار جو کہ تمام دنیا میں عام ہو رہا ہے' ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے جس سے اندرونی طور پر ناراضگی پروان چڑھتی ہے۔ اور بیرونی دنیا میں اس کا اظہار بغاوت یا ناراضگی کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر ایسی منفعل اور مفعول اور قابل رحم حالت آجاتی ہے کہ انسان منشیات کا استعمال کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔''[۱۵]

انسانی تہذیب کی اخلاقی صورت حال

زندگی کے مصنوعی اور حقیقی اصولوں کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے علی عزت بیگووچ لکھتے ہیں:

''تہذیب کے ہاتھوں انسان کبھی بھی اتنا مجبور نہیں ہوا جتنا کہ وہ اس معاملے میں مجبور ہوا ہے کہ وہ آلات و اوزار تباہ نہیں کیے جاسکتے جو انسانوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کی تباہی و بربادی اور ہلاکت کے لیے تیار کیے ہیں۔ انسان اپنے ہی ہاتھوں اپنے جیسے انسانوں کو تباہ و برباد کرتا ہے اور تہذیب وثقافت کی علامتوں کو اجاڑ دیتا ہے۔ یہ فرق زندگی اور مشن کا ہے۔ یہ فرق زندگی کے مصنوعی اصولوں اور سچے اصولوں کا ہے۔''[۱۶]

مصنف ایک بڑی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ موجودہ تمدن ہی سماجی برائیوں کے فروغ کا سبب ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ موجودہ مادی تمدن کو چھوڑے بغیر ان تمام آفات کا مقابلہ کیا جاسکے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

''حقیقی انسانی تمدن جن اقدار سے متعارف ہے ان میں سے کوئی بھی عریانی اور الکحل کے استعمال کی اجازت نہیں دیتی۔ حقیقت یہ ہے کہ سماجی برائیوں کا فروغ اخلاق سے عاری اور اعلیٰ انسانی اقدار کو

۱۴۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۱۳۲، ۱۳۳

۱۵۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۱۳۳، ۱۳۴

۱۶۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۱۳۵

نظر انداز کر دینے والے تمدن کا عطیہ ہے۔ اس تمدن کو راہِ راست پر لانے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ عقل وشعور سے مزیّن تہذیب ہے۔ چونکہ مادی تمدن کے نقطۂ نظر سے سائنس مذاہب کی طرف رجوع نہیں کرسکتی۔ اس لیے اصلاح واحوال کے مواقع میسر نہیں آتے۔''[۱۷]

سائنسی ترقی نے انسان کو ذہنی اور اخلاقی قحط میں مبتلا کر دیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

''سائنس بڑے بڑے اعداد وشمار کے ذریعے مصنوعات کی بڑھتی ہوئی ترقی، پیداواری شرح میں اضافے، توانائی اور انسانی قوت کے استعمال وغیرہ پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہے لیکن ادب وفنون انسان کے ذہنی اور اخلاقی قحط، تشدد، بے حمیت اور کھوکھلے پن کا اظہار کرتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں بھی امیر وکبیر ممالک کے طاقت ور اور دولت مند خاندانوں کے اندر لاچار، بے کس اور بے بس ہزاروں انسان ملتے ہیں جو اپنی سزا بھگت رہے ہوتے ہیں۔''[۱۸]

لغویت اور انکار مذہب دونوں ہی حقیقت پسندانہ طرز فکر کی نفی کرتے ہیں۔ یہ دونوں نظریے بتاتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں اجنبی ہے۔ انکارِ مذہب نجات کا راستہ تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے۔ جبکہ مذہب نے زندگی کا راستہ تلاش کرلیا ہے۔[۱۹]

مگر انسان کے سکون کو مسرت کہا گیا، اس کو کیسے نصیب ہوگا؟ مصنف اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''تمدن اور سائنس، اقتدار اور دیگر دولت کے ذریعے انسانی مسرت کا راز دریافت کرنے کی کوشش کی۔ یہ راز تو دریافت نہ ہوسکا لیکن یہ ثابت ہوگیا کہ جب تک انسان کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے گی انسانیت کا مسئلہ لاینحل رہے گا۔''[۲۰]

مختصر یہ لگتا ہے جیسے انسانی وجود سے بھی شرافت غائب ہوچکی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دوسری جنگوں نے انسانوں کو بے راہ رو بنادیا ہو یا پھر ٹیکنالوجی نے انسان کو مشین بنا کر رکھ دیا ہو۔

ترقی یافتہ ممالک میں تہذیبی ومعاشی چیلنجز کا حل

آج کی دنیا کو جو مسائل اور سوالات درپیش ہیں دو ہزار سال قبل بھی یہی سوالات موجود تھے۔ انسانوں کے تمام مصلحین اخلاق چاہے پیغمبر ہوں، مثلاً موسیٰؑ، مسیحؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا غیر نبی مثلاً کنفیوشش، گوتم بدھ، سقراط، کانٹ، ٹالسٹائی، مارٹن، بیز وغیرہ ایسے ادوار کا احاطہ کرتے ہیں جو کہ 600 قبل مسیح سے آج تک کارخانہ ہے (مارٹن، بیز کا انتقال 1965ء) میں ہوا اور ان سب کے سب نے ایک جیسے اخلاقی سچائیاں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کی پہلی تخلیق کے وقت ہی اس سے وابستہ ہوگئے تھے اور تمام کائنات کو تخلیق کے مرحلے سے گزرنا پڑا تھا۔ ذہانت، تعلیم اور تجربہ ہر معاملے میں ہمارا مددگار نہیں ہوتا کہ اس کے ذریعے سب کچھ سمجھا جا سکے۔ مسیحؑ نے اپنی سچائی کا اعلان کیا جب وہ

۱۷۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۱۳۶
۱۸۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۱۳۸
۱۹۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۱۴۱
۲۰۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۱۴۱

ابھی بچے تھے اور ان کی عمر تیس سال سے کچھ زیادہ ہی ہوئی تھی کہ ان کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا۔ خدا کے بارے میں حقیقت اور سچائی سمجھانے کے لیے ان کو نہ علم کی ضرورت تھی کیونکہ یہ چیزیں سمجھانے کے لیے علم اور تجربے کا سہارا نہیں لیا جاسکتا۔ ''کیا وہ دانا لوگوں سے چھپا ہوا اور نادانوں پر عیاں نہیں ہے۔'' مصنف اس صورت حال کو یوں بیان کرتے ہیں:

> اخلاقی اصولوں میں تاریخی، سیاسی اور سماجی فرق کے باوجود ہمیں یکسانیت ہی نظر آتی ہے۔ ایپک لٹیٹس اور مارکوس آریلیٹس میں سے ایک غلام ہے اور ایک بادشاہ ہے۔ دونوں ایک ہی قسم کی اخلاقیات کی تبلیغ کرتے رہے اور کم وبیش ایک ہی قسم کے الفاظ میں اس اصول کی تصدیق کانٹ کے بیان کردہ اصول سے بھی ہوسکتی ہے۔[۲۱]

خاندان کے بارے میں اشتراکی نقطۂ نظر

اشتراکی نقطۂ نظر سے خاندان معاشرے کی بنیادی اینٹ نہیں ہے جیسا کہ پرانے دساتیر میں قرار دیا گیا ہے۔ خاندان اور معاشرے ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ خاندان میں محبت اور جذبات لوگوں کو جوڑے رکھتے ہیں۔ معاشرے میں مفاد اور ذہانت یا دونوں ان کو جوڑے رکھتے ہیں۔ مصنف فرماتے ہیں:

> ''معاشرے کے اندر رونما ہونے والا ہر تغیر خاندان کے خاتمے کا متقاضی ہوتا ہے۔ اگر ایک خیالی ریاست میں سماجی اصولوں کو آخر تک بروئے کار لایا جائے تو اسے خاندان کسی صورت میں بھی تسلیم اور برداشت نہیں کرتا۔ خاندان میں ذاتی تعلقات، رومانوی خیالات اور اندرونی جذبات کی بھٹیاں ہوتی ہیں اور اس خیالی ریاست سے سراسر متضاد ہوتی ہیں۔ اینجلز نے انہی دائروں کو مدنظر رکھتے ہوئے تسلیم کیا تھا کہ اولین دور میں خاندان کا آغاز دائروں میں موجود ہونے سے شروع ہوا۔ پہلے آغاز قبیلے کے اندر ہوا جس کے اندر متضاد جنسوں کے افراد منفی تعلق ہوگئے۔ آغاز میں قریب کے رشتہ داروں اور بعد میں دور دراز کے رشتہ داروں میں بعد پیدا ہونے لگے۔ آخر میں شادی کے بندھن میں بندھے ہوئے افراد کا جوڑا رہ گیا۔ یہ ایک ایسا مالیکیول ہے جس کے بکھرنے سے خاندان بذات خود بکھر جاتا ہے۔ خیالی ریاست میں ہر دوسری چیز کی طرح بچوں کی پرورش بھی ہر ذمہ داری سے مبرا ہے کیونکہ دوسرے بہت سے کاموں کی طرح یہ کام بھی صرف ایک کام یا 'شکل پیداوار' ہے۔''[۲۲]

خاندان اور مادہ پرست تہذیب

اس معاملے میں اینجلز اس سے بھی زیادہ سفاکانہ رائے رکھتا ہے ''مادہ پرستانہ تصورات کے مطابق تاریخ کے اندر فیصلہ کن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے لیے ضروریات کی پیدا وار در پیداوار کا سلسلہ جاری رہے۔ اس کی نوعیت بھی دو شاخی ہے۔ ایک طرف تو بقا کے ذرائع مثلاً خوراک، لباس، رہائش اور ان چیزوں کو تیار کرنے کے لیے اوزار کی فراہمی ہے اور دوسری طرف بذات خود انسانوں کی پیدائش کا مسئلہ ہے تاکہ وہ نسل برقرار رہے۔ آگے وہ لکھتا ہے:

۲۱۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۰۷ ۲۲۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۰۶، ۲۰۷

''یہ واضح ہے کہ عورتوں کی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ عورتوں کو دوبارہ عوامی سرگرمیوں میں شامل کردیا جائے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ الگ تھلگ خاندان کا وجود بطور معاشرتی و سیاسی یونٹ ختم کردیا جائے۔ نجی ملکیت کو سماجی صنعت میں تبدیل کردیا جائے۔ بچوں کی داشت برداشت اور تعلیم سرکاری معاملہ ہو۔ معاشرہ تمام بچوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے' چاہے ان کی پیدائش جائز طریقے سے ہوئی ہو یا ناجائز طریقے سے ہوئی ہے۔''[۲۳]

خاندان اور عورت: فرانسیسی نقطۂ نظر

فرانسیسی ادیب سائمن باوار جو فرانس اور دیگر ممالک میں آزادیِ نسواں کی تحریک کا معروف کارکن رہا ہے اس کی رائے بھی اس بارے میں واضح ہے وہ کہتا ہے:

''جب تک خاندان کے تصور کو ختم نہیں کیا جاتا، جب تک 'ماں' کے ادارے کو ختم نہیں کیا جاتا اور جب تک 'مادی جذبے' کو ختم نہیں کیا جاتا' عورت ہمیشہ مطیع اور ماتحت رہے گی۔''

تمدن خاندان کا خاتمہ صرف نظری طور پر نہیں کرتا بلکہ وہ یہ کام شعوری اور حقیقی طور پر سرانجام دیتا ہے۔ سب سے پہلے مرد نے خاندان کو چھوڑا، پھر عورت نے خاندان کو چھوڑا اور پھر بچوں نے بھی خاندان کو چھوڑا۔ خاندان کے خاتمے کی جڑیں کئی پہلوؤں میں واضح نظر آتی ہیں۔ شادیوں کی تعداد گھٹتی جارہی ہے۔ علاقوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ ملازمت کرنے والی عورتوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ ناجائز بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور یہ سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ نوجوانی میں بیوہ یا رنڈوے ہوجانے والوں کی تعداد کو یہاں مدنظر رکھنا چاہیے اور ان کی عمومی وجہ اموات ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ دل کی بیماریوں اور دیگر مہلک بیماریوں کی تعداد میں اضافہ مدنظر رہنا چاہیے جو تمدن کے ساتھ ہی متعلق ہے۔

1960ء میں کیلی فورنیا میں جتنی شادیاں ہوئی تھیں اتنی ہی طلاقیں بھی واقع ہوئی تھیں۔ یہ کیلی فورنیائی تناسب دنیا کے تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مراکز میں بھی جلد ہی پہنچ گیا۔ نئی شادیوں کے ساتھ ساتھ طلاقوں کا تناسب دس فیصد تھا۔ جو 1973ء میں 72 فیصد تک پہنچ چکا تھا۔ پچھلے دس سالوں میں سوئٹزرلینڈ میں طلاقوں کا تناسب پچھلے بیس سالوں میں چار گنا تک بڑھ چکا ہے۔ 1945ء سے 1975ء تک کے تین دہائیوں میں چیکوسلواکیہ میں طلاقوں کی تعداد تین گنا بڑھ چکی ہے۔ پراک میں ہر تیسری شادی کا انجام طلاق ہوتا ہے۔ فرانس میں سکول کی لڑکیوں سے ایک سوالنامے کے ذریعے معلوم کیا گیا کہ ان کی ترجیحات کیا ہیں؟ تو انہوں نے آزادی اور آرام دہ زندگی کو اولین اور خاندان کو آخری ترجیح قرار دیا۔

اقوام متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے اعداد و شمار کے مطابق پچھلے پچیس سالوں میں معاشی زندگی کی سرگرمیوں میں عورتوں کا حصہ توقع سے بھی بڑھ چکا ہے۔ 1975ء میں دنیا کے تمام ملازم پیشہ لوگوں میں سے تیس فیصد خواتین تھیں۔ اس طرح ملازم پیشہ عورتوں کی سب سے بڑی تعداد روس میں ہے۔ یہاں سو میں سے بیاسی عورتیں کام کرنے

۲۳۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۳۸، ۲۳۹

کی اہل ہیں اور رجسٹرڈ ہیں۔ مشرقی جرمنی میں اسی فیصد عورتیں اور پولینڈ میں تریسٹھ فیصد عورتیں کام کرتی ہیں۔ ان ممالک کے بعد فن لینڈ، سویڈن، چیکوسلواکیہ، ڈنمارک اور جاپان کا نمبر آتا ہے۔ برطانیہ، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، امریکہ اور مغربی جرمنی کے ممالک میں عورتوں کی تقریباً نصف تعداد (49 سے 52 فیصد تک) ملازم پیشہ ہے۔

جن اشتراکی ممالک میں خونریز فسادات برپا ہوئے اگرچہ وہ ان ممالک کی طرح ترقی یافتہ تو نہیں ہیں، جن کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے۔ تاہم فسادات کی وجہ سے نظریاتی ریاست کے اثرات، خاندان کے ساتھ رویہ اور عورتوں کی ملازمت ہے۔ اسی طرح کی ایک اور حقیقت یہ ہے کہ جس کی تکنیکی ترقی کے ذریعے وضاحت نہیں کی جاسکتی اور وہ یہ ہے کہ امریکہ اور روس میں ناجائز بچوں کی تعداد برابر ہے یعنی آبادی کا دس فیصد۔[۲۴]

ایک جائزے کے مطابق امریکہ میں گھر سے بھاگنے والے بچوں کی تعداد پچھلے سالوں میں دگنی ہوچکی ہے اور 1976ء میں ان کی تعداد بیس لاکھ ہوجائے گی۔[۲۵]

خاندان کا ادارہ

تمام مذاہب میں خاندان کی وکالت اس طرح کی گئی ہے گویا یہ خاندان فرد کے لیے گھونسلہ ہو اور عورت کو اس کا اولین استاد قرار دیا گیا ہے۔ اس جیسے استاد کا مہیا ہونا ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ تمام خیالی ریاستوں میں سماجی تعلیم، نرسری سکول، نونہالوں کے سکول، بچہ گھر وغیرہ کے متعلق بڑے اہتمام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس سے صرف نظر کے ساتھ کہ ہم ان اداروں کو کیا نام دیں، ان سب میں ایک چیز مشترک ہے کہ ان میں سے 'ماں' کو خارج کردیا گیا ہے اور بچوں کی نگہداشت کو ملازمین کے حوالے کردیا گیا ہے۔ افلاطون جس نے خیالی ریاستوں کے بارے میں سب سے پہلے منظّم سماجی تخیل واضح کیا اسی نے سب سے پہلے منظّم سماجی نظریہ بھی پیش کیا۔ انیسویں صدی اور بیسویں کی اشتراکی تحریکوں میں یہ نظریہ اپنے عروج تک پہنچ گیا ہے۔ یہ رویہ بڑا قانونی ہے اور اگر انسان سماجی حیوان ہے، (جو اس کے وجود کا صرف ایک حصہ ہے) تب مشرق، سماجی تعلیم گوشہ اطفال اور نام نہاد نظری ریاست اس کا صحیح حل ہیں جبکہ مادری الفت، پدری شفقت، خادنان، فنون اور مذہب کے متعلق تعلیم، انفرادیت اور آزادی غیر معمولی رومانوی اور افسانوی تصورات کے سوا کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ایک مثالی نظریہ اور خیالی ریاست میں ہر شخص اپنی ذمہ داری کسی غلطی کے بغیر مکمل طور پر سرانجام دیتا ہے۔ ماں اور خاندان اس مکمل نظام اور تربیت کو خراب کرسکتے ہیں اور وہ نظام تہہ و بالا ہوسکتا ہے جس کی بنیاد یکسانیت اور نفی ذات پر ہے۔

ایک ماں بچے کو جنم دیتی ہے اور اس کی پرداخت و نگہداشت کرتی ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح ایک ریاست ایک پودے کو درخت بناتی ہے اور وہ مستقبل کی خیالی ریاست کا حقیقی باشندہ بن جاتا ہے۔ نرسری ایک کارخانے اور ایک تعلیمی مشین کا نام ہے۔ سیٹانسلا گیٹر ادووچ سٹرومیلین (1887 تا 1974ء) جو معروف روسی ماہر تعلیم اور طویل عرصے تک روسی حکومت کا ایک کارپرداز رہا ہے' اس نے 1960ء کے عشرے میں لکھا: تعلیم کی سماجی حیثیت کا مطلق فائدہ اسی وقت اٹھایا جاسکتا ہے کہ ہم اس کی شکل کو پندرہ بیس سال کے اندر اندر اس طرح بدل دیں کہ جھولے سے بلوغت تک تمام شہری اس سے

۲۴۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۴۲

۲۵۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۴۲

آ گاہ ہوجائیں۔

یہ اعلیٰ درجے کا دانش ورفخر کے ساتھ اپنا خوفناک خیال بیان کرتا ہے:

''یہ روسی شہری جو ہسپتال میں جنم لے اس کو گوشہ اطفال میں بھیج دیا جائے پھر ابتدائی تعلیم کے سکول یا نونہالوں کے اقامت گھر پھر اقامتی سکول اور پھر وہاں سے ایک آزاد زندگی کے آغاز کے لیے ایک کارخانے یا اعلیٰ تعلیم کے ادارے میں شامل کر دیا جائے۔''

ہمیں یہاں کہیں ماں یا خاندان کا ذکر نہیں ملتا۔ ظاہر ہے جس کا وجود ہی باقی نہ رہنے دیا گیا اس کا ذکر کیوں ہو۔ تعلیم کی جگہ انسان کی نشوونما کا ذکر ہے۔ گویا انسان کی پرورش بھی ایک ٹیکنالوجیکل کام ہے جس طرح مرغی کے چوزوں کی پرورش ہوتی ہے۔[۲۶]

مزید مصنف لکھتے ہیں:

''کچھ ایسے اشارات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سوویت یونین خاندان کے متعلق اپنے رویے کو تبدیل کر رہا ہے۔ اصولوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ آیا سٹرولین یا اینجلز کا خاندان کے متعلق (اس کے سوا کوئی) مبغوضانہ رویہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ لیکن کیا اینجلز خاندان کے متعلق اس کے سوا کوئی اور رویہ اختیار کرسکتا تھا (ایک مستقبل کے ماتحت تھا) ایک مستقل تمدن سے اینجلز یہ نتائج اخذ کر رہا تھا اور یہ تمدن خیالی ریاست کے تصورات کے ماتحت تھا اور ثقافت کو اس وقت تک مکمل طور پر سمجھا نہیں جاسکتا جب تک کہ یہ انسان کی شخصیت کو مکمل طور پر تباہ و برباد نہ کر کے رکھ دیتی۔ اس طرح کا آدمی اس کی میکانیت، اس کے ڈھانچے، اس کے اداروں، اس کی اجتماعیت، اس کے عمومی مفادات، ریاستی انصاف اور نظم و ضبط وغیرہ میں فٹ نہیں بیٹھ سکتا اور اسی وجہ سے آندرے وزنیکی کے الفاظ میں انسان اور جبری مشقت کے درمیان نہ ختم ہونے والے الفاظ کی جنگ جاری ہے۔''[۲۷]

ایک عورت بچے کو جنم دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ چونکہ یہ بچہ اس سے فوراً چھین لیا جائے گا۔ تمام نام نہاد مہذب ممالک میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ شرح پیدائش یا تو منجمد ہوچکی ہے یا اس میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یا تو ماؤں کی حالت ہے یا یہ خواہش کہ ذمہ داریوں سے پاک آسانی سے گزرنے والی زندگی میں 'بچے کی مداخلت' نہ ہونے دی جائے اور اس کی حقیقی وجہ صرف یہ ہے کہ مذہبی اور تہذیبی سرگرمیوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ بہت سے یورپی ممالک میں شرح آبادی واضح طور پر کم ہو رہی ہے اور منفی ہوتی جا رہی ہے۔ 'مائرے سونے' جو سوبورن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، دعویٰ کرتے ہیں کہ سفید نسل کو ختم ہونے کا خدشہ لاحق ہے۔ اس کے بیان کے مطابق جرمنوں کے اندر شرح پیدائش اس قدر کم ہے کہ ممکن ہے کہ اگلی صدی کے آغاز میں وہ بالکل ختم ہوچکے ہوں۔ آبادی کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ فرانس کی آبادی جو اب پانچ کروڑ بیس لاکھ ہے، اکیسویں صدی کے پہلے نصف میں صرف ایک کروڑ ستر لاکھ رہ جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اعداد و شمار

۲۶۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۴۳، ۲۴۴ ۲۷۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۴۴، ۲۴۵

مبالغے پر مبنی ہوں، لیکن گوشواروں سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔ 1976ء تک جرمنی میں رہائش پذیر لوگوں کی تعداد میں اعشاریہ تینتیس فیصد تک کی کمی آ گئی تھی جبکہ 1975ء میں یہ کمی دولاکھ تھی۔ 1974ء کی نسبت 1975ء میں یہ کمی اعشاریہ چھپن فیصد تھی۔ مغربی برلن میں یہ کمی 1.7 فیصد تھی۔[۲۸]

موجودہ تہذیب اور عورت کا کردار

موجودہ تمدن و ثقافت نے عورت کو استعمال کی چیز بنا کر رکھ دیا ہے اور عورت کے اندر قابل تعریف اور قابل احترام چیز اس کی شخصیت ہی ہے۔ یہ صورت حال بارہا مشاہدے میں آئی ہے۔ لیکن 'حسن کے مظاہروں' یا خالصتاً خواتین کے کچھ پروگراموں مثلاً ماڈلنگ (اشتہار بازی) میں تو اور بھی نمایاں ہوجاتی ہیں۔ اس میدان میں عورت کی کوئی شخصیت باقی نہیں رہتی' بلکہ وہ تو انسان بھی باقی نہ رہ جاتی اور 'خوب صورت جانور' کے سوا اس کی کوئی شناخت نہیں رہتی۔ اس سلسلے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ثقافت نے مادیت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ اس ثقافت نے عورت کو ماں کیلفظ سے پکارنے کی بجائے سیلز گرل، ماڈل، دوسرے بچوں کی استانی، سیکرٹری اور صفائی کرنے والی عورت کا لقب دینا زیادہ مناسب خیال کیا۔ یہی ثقافت تھی جس نے ماں کے مقام اور ذمہ داری کو غلامی قرار دے کر اس غلامی سے نجات دلانے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ ثقافت اس چیز پر فخر کرتی ہے کہ اس نے اتنی عورتوں کو خاندان اور بچوں سے آزاد کر کے 'ملازم پیشہ' بنادیا ہے۔ اس کے برعکس مذہبی تہذیب نے ہمیشہ عورت کو ماں کے درجے میں عظیم الشان احترام بخشا ہے۔ اس نے اسے ایک علامت، ایک راز اور ایک مقدس ہستی بنایا ہے۔ تہذیب نے ماں کی شان میں بہترین عقیدے اور اشعار لکھوائے ہیں۔ اس تہذیب نے موسیقی تخلیق کروائی ہے۔ شان دار پینٹنگز، تصاویر اور مجسمے بنوائے ہیں' جبکہ موجودہ تمدن میں ماں سے نفرت جاری ہے۔ پکاسو نے اپنی شان دار تصویر ماں کی مادیت کے متعلق ہی بنائی اور ماں کے تصور کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس نے کہا کہ تہذیب تمدن اور ثقافت کے لیے ماں ابھی تک زندہ ہے۔[۲۹]

عصری تہذیبی چیلنجز کا مذہبی حل

مختلف نظام ہائے زندگی کے تذکرے کے بعد مصنف ان چیلنجز کا مذہبی حل بیان کرتے ہیں اور وہ نکتہ وار لکھتے ہیں:

> اسلام کی دو تاریخیں ہیں۔ ایک تاریخ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دور کی ہے اور ایک تاریخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے شروع ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ کے دور اور اس کی تاریخ کو بڑی تنگ نظری کے ساتھ تاریخ اسلام قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ سے پہلے کی تاریخ کو پڑھے بغیر اسلام کی مکمل تاریخ کو سمجھنا ناممکن ہے۔ خصوصاً اس دور کے مطالعے کے بغیر کوئی بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ جس دور میں یہودیت اور نصرانیت کا ظہور ہوا ہے۔ یہودیت، نصرانیت اور اسلام،

۲۸۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۴۵، ۲۴۶ ۲۹۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۴۷، ۲۴۸

موجودہ معلوم تاریخ میں ان تین مذاہب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان مذاہب کے ذریعے ہی انسان تاریخ کا محور بنا رہا ہے اور اس نے انسانیت کو مجموعی طور پر سمجھنا سیکھا ہے۔ ان مذاہب کے ذریعے ہی انسان نے اندرونی اور بیرونی زندگی، ظاہری اور باطنی ترقی، ان کے باہمی تعلق اور ان کی حدود کو سمجھا ہے۔ یہودیت اور نصرانیت دونوں کی تاریخی کامیابیوں اور ناکامیوں کے بعد ہی انسانیت اسلام کے فیصلہ کن تجربے سے روشناس ہوئی ہے۔ موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، تینوں انسانیت کے لیے راہنما اور یکساں قابل احترام ہیں۔ یہودی ذہن کے تمام خیالات اور نظریات 'زمین پر جنت' کے گرد گھومتے ہیں، کتاب یعقوب' اس تمنا، خواہش، اظہار اور خواب کا نام ہے کہ انصاف ہونا چاہیے اور انصاف کے عمل کو زمین پر ہی پورا ہونا چاہیے۔ دوسری دنیا میں نہیں کہ ابھی اور یہیں۔[۳۰]

یہودی مذہب اور تہذیبی حل:

سب سے پہلے یہودیت کا حل پیش کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

یہودیوں کی مادہ پرستی نے انسان کے ذہن کو دنیا کی طرف موڑ دیا۔ یہودیوں کی تاریخ میں سود کی نشوونما اسی خیال کے سبب ہوئی۔ مسیحیت نے اس کے برعکس روح کی بالیدگی کا پیغام دیا۔[۳۱]

عیسائیت میں تہذیبی چیلنجز کا حل:

عیسائیت میں تہذیبی چیلنجز کا جو حل پیش کیا گیا ہے اس کے بارے میں مصنف ان الفاظ میں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

عیسائیت کی تعلیمات کے مطابق انسانی توانائی دو متضاد سمتوں میں ضائع نہیں کی جانی چاہیے اور یہ متضاد سمتیں جنت اور دنیا ہیں۔ کوئی بھی شخص دو آقاؤں کی خدمت نہیں بجا لاسکتا کیونکہ وہ یا تو ایک سے محبت کرے گا اور دوسرے سے نفرت کرے گا یا ایک کی عزت کرے گا اور دوسرے کو حقیر جانے گا۔ تم خدا اور شہنشاہ کی عبادت بیک وقت نہیں کر سکتے۔[۳۲]

انجیل میں بیان ہوا ہے کہ اپنی زندگی کے بارے میں مت سوچو کہ تم کیا کھاؤ گے، کیا پیو گے۔ اگر تمہاری اپنی آنکھ تمہاری خلاف ورزی کرے تو اسے نکال پھینکو اور اگر تمہارا اپنا ہاتھ تمہاری خلاف ورزی کرے تو اسے کاٹ پھینکو۔[۳۳]

مذہب جس راستے کا دعوے دار ہے وہ مشکل بھی اور صرف مخلص لوگوں کے لیے ہے۔ جب کہ قرآن کہتا ہے: **لایکلف اللّٰہ نفسا الا وسعھا**. اللہ کسی نفس پر اس کی قوت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔[۳۴]

۳۰۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۵۱، ۲۵۲

۳۱۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۵۵

۳۲۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۵۵

۳۳۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۵۶

۳۴۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۵۷

انسان اور اس کی روح !۔۔۔ یہی رشتہ آنحضرتؐ اور مسیح ناصریؑ میں ہے۔ مقدس صحائف اور روح میں فطرت کی یکسانیت ہے۔ اپنی اصل میں وہ ایک ہی راز رکھتے ہیں۔ مقدس صحائف اور روح علامتی طور پر ایک دوسرے کی نمائندگی بھی کرتے ہیں اور باہم ایک دوسرے پر روشنی بھی ڈالتے ہیں۔ اسلام انسان کی روحانی تکمیل کا نام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ زندگی کی تشریح بھی ہے اس کے بہت سے پہلو اور گوشے ایسے ہیں جن کی شعر اور رومانویت پسند وضاحت نہ کر پائیں۔ قرآن ایک حقیقت پسند اور غیر شاعرانہ کتاب ہے۔ فرشتوں کا انسانوں کے آگے جھک جانا، خدا نے بندوں کو سکھایا ہے اور اولین انسان کو یہ سکھایا گیا ہے کہ تمام اشیا کے نام سیکھ لے اور اس سے انسان کی زندگی اور اس کے مظاہر کی جامد اور مقید معلوم اشیا پر برتری ظاہر ہوتی ہے۔[۳۵]

مسیح کی تعلیمات سے مسیحیوں نے بندہ خدا کا تصور اخذ کیا اور مسیحؑ کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ آنحضرتؐ بہرحال ایک انسان ہی ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کا آنا بے مقصد ہو جاتا۔ آنحضرتؐ کی ذات سے ایک مصلح اور ایک مجاہد کا تصور ملتا ہے اور مسیحؑ کی ذات سے ایک فرشتے کا تصور ابھرتا ہے۔ یہی معاملہ عورتوں اور قرآن کا ہے۔ قرآن عورتوں کو ان کے صحائف کی 'مریم' اور 'مارتھا' نہیں بننے دیتا۔ اسی وجہ سے مسیحیوں کا آنحضرتؐ کی ذات پر یہ اعتراض کہ آپؐ کی ذات بہت زیادہ انسانی ہے 'کم فہمی' کا نتیجہ ہے۔ قرآن خود اصرار کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً انسان ہیں اور آپؐ کی ذات پر مستقبل میں ہونے والے تمام اعتراضات کا پہلے سے ہی یوں دفاع کر دیتا ہے:

''یہ کیسا رسول ہے جو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟'' تو قرآن کہتا ہے کہ رسولؐ چونکہ انسانوں کی طرف آیا ہے۔ اس لیے خود بھی انسان ہیں۔[۳۶]

مذہب اسلام اور جدید عصری چیلنجز کا حل

اسلام کی تہذیب سے گہری وابستگی کا اس امر سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے خواندگی کو تہذیب کے انتہائی طاقت ور آلہ پیمائش میں شمار کیا۔ لکھنے پڑھنے کا ذکر تو قرآن کی اولین آیتوں میں ہی کیا گیا ہے۔ مصنف اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

تحریر، مذہب کے لحاظ سے اجنبی چیز تھی۔ اناجیل طویل عرصے تک زبانی روایت کے طور پر موجود رہیں اور جہاں تک ہم جانتے ہیں مسیحؑ کے کم وبیش ایک نسل کے بعد اناجیل لکھی گئیں۔ اس کے برعکس آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی نازل شدہ آیات فوراً ہی کاتبوں کو لکھوا دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ طرز عمل معتوب فریسیوں کے طرز عمل کے بہت قریب ہے۔[۳۷]

جیسا کہ نشے کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

۳۵۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۶۱، ۲۶۲

۳۶۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۶۳

۳۷۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۶۸

''اسلام کے اندر نشے کی ممانعت کا ایک سماجی مرتبہ ہے کیونکہ نشہ اولین طور پر ایک سماجی برائی ہے۔ مذہب کو عمومی طور پر نشے کے خلاف کچھ کرنے کا موقع نہ ملا۔''۳۸

ایک وحدت کے طور پر اسلام کی بے مثال خوبی یہ ہے کہ اگرچہ کچھ لوگوں نے اس کے مذہبی عنصر پر زور دیتے ہوئے اس کے دوسرے پہلو 'اتحاد' کو قربان کرنے کی کوشش کی۔ تاہم 'اتحاد' موجود رہا۔ موجودہ دور میں اسلام کو مذہب اور تصوف تک محدود کر دیا گیا۔ جس قدر سرگرمی محدود ہوتی ہے اسی قدر ہم دنیا میں حصے سے محروم رہ جاتے ہیں۔۳۹

اسلام کی مادہ پرستی کے بارے میں ایک خوفناک تصور قائم کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ وہ فطری اور سماجی عناصر ہیں جو اس کو ملے ہیں اور جن کے باعث دیگر انتہا پرستانہ یورپی ممالک کے لیے اسلامی دنیا نا قابل قبول ہوگئی ہے۔۴۰

اسلام کا معاشرتی کا نظام

اسلام اور عبادت:

اسلام میں عبادت اور معاشرت کے تعلق پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

اسلام دنیا کو کس طرز پر چلانا چاہتا ہے۔ یہ عمل صلوٰۃ سے واضح ہوتا ہے۔ صلوٰۃ کے ذریعے دو حقیقتیں واضح ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ دنیا میں بنیادی انسانی مقاصد دو ہیں۔ دوم یہ کہ مقاصد منطقی طور پر جدا جدا ہونے کے باوجود انسانی زندگی میں یکجا کئے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ ظاہری صفائی حاصل کیے بغیر صلوٰۃ ادا نہیں کی جاسکتی اور روحانی مدارج اور ظاہری اعمال اور سماجی کوششوں کے بغیر طے نہیں کیے جاسکتے۔ جس چیز کو ہم دوگانہ وحدت قرار دیتے رہے ہیں، اس کا جامع ترین اظہار صلوٰۃ ہے۔ صلوٰۃ اس حقیقت کو ٹھوس شکل دیتی ہے۔۴۱

اسلام کی عبادت فطری اور اس کے عوامل کو بھی شامل رکھتی ہے۔ دیگر مذاہب اسمنطق سے عاری ہیں۔ نماز، روزہ اور حج کئی فلکیاتی امور کے ساتھ متعلق ہیں لیکن اسلام واضح کر دیتا ہے کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف۔ لہٰذا ہماری نماز کائنات زمان و مکاں کا حصہ ہے۔ اسلام کے دور اول میں فلکیات کی نشوونما خصوصی طور پر ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اسلامی عبادات ادا کرتے ہوئے وقت اور مقام کا صحیح ترین تعین بھی مطلوب ہوتا تھا۔ ہم دلائل سے یہ بات ثابت کرسکتے ہیں کہ فلکیات میں یہ ترقی اسلام کی وجہ سے ہوئی۔۴۲

۳۸۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۲۶۹
۳۹۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۲۶۹
۴۰۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۲۷۰
۴۱۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۲۷۵
۴۲۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص:۲۷۷

اسلام اور سیاست:

اسلام میں سیاست کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

اسلام امارت کا خاتمہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ غربت اور بدبختی کو کم کرنا چاہتا ہے۔غربت کیا ہے؟ اس سے مراد اشیا کی عدم دستیابی ہے، ان لوگوں کے لیے جو معمولی زندگی بسر کرتے ہیں۔جن کے پاس زندہ رہنے کے لئے جن کم ازکم اشیا کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی موجود نہ ہو اور کم ازکم کا معیار زندگی کے بھی نچلے درجے کی زندگی گزار رہے ہوں۔کم ازکم معیار زندگی کے اندر اشیا کا وہ مجموعہ شامل ہے جو ایک شخص اور اس کے خاندن کے لیے ان کی جسمانی اور معاشرتی ضروریات پورا کرنے کے لیے کافی ہوں۔[۴۳]

اسلام کی عبادات کے معاشرتی اثرات مصنف اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

''اصل چہرہ زکوٰۃ کے اصول پر عمل کرنا ہوتا ہے کہ معاشرے کے صاحب ثروت لوگ ثروت سے محروم لوگوں کے حقوق کا خیال کریں۔ یہ معاشرے کی بہت بڑی خوبی شمار ہوتی ہے۔ بلاشک وشبہہ ایک روز جب حقیقی اسلامی نظام نافذ ہوگا تو وہاں زکوٰۃ کے اس اصول پر پوری طرح عمل ہوگا۔ نیز آبادی اور آمدنی میں یکسانیت اور ہم آہنگی ہوگی۔ نیز اس اصول کے ذریعے فاضل دولت رکھنے والے اپنی دولت کا فالتو حصہ اصول زکوٰۃ کے مطابق ضرورت مندوں میں تقسیم کردیں گے۔ ایسی زکوٰۃ غریبوں کا حق ہوگی اور اگر ضرورت ہوگی تو اسے بزور بھی حاصل کیا جائے گا۔[۴۴]

روزہ اور حج کے فلسفے پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف رقم طراز ہیں:

اسلامی روزہ ایک تعلیمی اور تربیتی عمل ہے۔جس کے انتہائی خوش کن اثرات مرتب ہوتے ہیں۔شہنشاہ کا فقر یا کسان کی جھونپڑی، فلسفی کی جائے قیام ہو یا ایک شہری کا گھر ہو سب اس کے اوپر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دل اور دماغ کی کامل یکسوئی اور خدا خوفی کے ساتھ اس حکم پر عمل کیا جاتا ہے۔ اسلام کے پانچویں رکن حج کو لیجیے، یہ مذہبی شعائر ہے۔تجارتی میلہ ہے۔ سیاسی اجتماع ہے یا اس میں یہ سب باتیں جمع ہیں۔ حج خالصتاً ایک مذہبی اجتماع اور عبادت ہے لیکن اس میں دیگر تمام چیزیں بھی اکٹھی ہوگئی ہیں۔ یہ اسلام کی دو بڑی پوزیشنیں ہیں۔ یہ چیز دیگر بہت سے ذریعوں سے بھی ثابت ہوتی ہے۔قرآن کی اس آیت پر غور کیجیے:

''جھوٹی قسم کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اور کھانا جو تم اور تمہارے اہل خانہ کھاتے ہیں یا انہیں سادہ لباس دو یا ایک غلام آزاد کرو اور اگر اس کی قدرت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھو۔''

یعنی مفید سماجی اعمال کو بھی عبادت ہی قرار دیا گیا ہے بلکہ خالصتاً روحانی اعمال پر انہیں فضیلت دی گئی

۴۳۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش،ص:۲۸۰ ۴۴۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش،ص:۲۸۱

ہے اور بعد والے احکامات کی اجازت اس وقت ہے جب اولین احکامات پر عمل نہ کیا جاسکتا ہو، مذکورہ قرآنی آیات میں روزہ کفارہ توبہ اور دعا کا بدل بیان کیا گیا ہے۔۴۵

الغرض، اسلام ایسا مذہب نہیں ہے جو انسان کو زمین کی نعمتوں سے محروم کردے یا ہر وقت یہ بتاتا رہے کہ وہ بھی منع ہے یہ بھی منع ہے۔ اسلام دنیا کو اور زمین کو لعنت زدہ قرار نہیں دیتا۔۴۶

اسلام اور سائنسی ترقی:

قرآن بار بار مطالبہ کرتا ہے کہ مشاہدے کے ساتھ ساتھ غور و فکر بھی کیا جائے اور ایک مذہب ہے اور دوسری سائنس۔۴۷

اسلام سائنس کو صحیح رخ دیتا ہے اور اس کی راہ کو متعین کرتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

''اسلامی سائنس کی تاریخ کے معروضی مطالعے سے معلوم ہوگا کہ ظہور اسلام کے بعد اولین صدیوں میں سائنسی علوم کی ترقی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب اسلام کی تعلیمات کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ وادی فرات میں جب اسلام پہنچا تو اس کا سامنا ستارہ پرستی سے ہوا اور اس علم کے جاننے والوں کے پاس تین ہزار سال قبل کی معلومات تھیں۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کی قسمت کا ستاروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام کی وحدانیت اور منطقیت نے ستارہ پرستی کو علم فلکیات میں تبدیل کردیا۔ بغداد کے قریب فلکیات کے مطالعے اور تحقیق کے متعلق ایک رصدگاہ تھی، اس کے متعلق سیدلٹ کہتا ہے:..... ''آغاز ہی سے بغداد کے فلکیاتی طبقہ فکر کی نمایاں خصوصیت اس کا سائنسی طرز استدلال رہا ہے۔ معلوم سے نا معلوم کو تلاش کیا جائے اور کسی ایسی چیز کو تسلیم نہ کیا جائے جس کو مشاہدے کے ذریعے ثابت نہ کیا جاسکے۔ خیال نے جو تقویم تیار کی ہے گریگورین کیلنڈر کے بہت قریب ہے جسے ہم آج کل استعمال کرتے ہیں''۔۴۸

اسلام نے سائنس کو الگ نہیں کیا۔ مصنف لکھتے ہیں:

''مذہب اور سائنس کو یکجا کرنے کی یہ کوشش جو خالصتاً ایک اسلامی رجحان ہے اس کا اندازہ مساجد اور مدرسوں کی یکجا تعمیر سے لگایا جاسکتا ہے۔ مساجد کے ساتھ مدارس کی تعمیر کا سراغ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے دور سے شروع ہوا۔ اس نظام کو خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں منظّم کیا گیا۔ مساجد اور مدارس کی الگ الگ تعمیر کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا اور دینی مدارس قائم کیے گئے۔ لیکن مدارس میں جو تعلیم دی جاتی تھی اس کے اندر ظاہر و باطن کی یکسوئی یعنی دوگانہ یکجہتی کے اصول کو کارفرما رکھا گیا۔''

۴۵۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۸۵

۴۶۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۸۶

۴۷۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۲۸۸

۴۸۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۳۰۲، ۳۰۳

زائنلز کہتا ہے:

''پوری تاریخ میں مسجد صرف عبادت کی جگہ کبھی بھی نہیں رہی۔ اسلام کے اولین ادوار میں ہر وہ جگہ جہاں نیک لوگ اکٹھے ہوتے ہوں' چاہے یہ مدرسہ ہو یا بازار' منڈی ہو یا چوپال' اس کو مسجد سمجھ لیا جاتا تھا۔ اس طرز فکر اور رجحان کا اظہار اسلام کے ثقافتی دائرے میں ہوا۔ مسجد مکتب ایک منفرد عمارت جس میں دو خدمات سرانجام دینی ہوتی تھیں اور یورپ کی زبانوں میں اس لفظ مسجد یا مکتب کا متبادل لفظ موجود نہیں۔ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ فرانسیسی زبان ہے جس میں دو الفاظ کو جوڑ کر (Mosque Ecole) بنادیا گیا ہے۔''[۴۹]

انسان کی عظمت اور وقار کو تسلیم کرنے کے ساتھ اسلام نے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا لیکن انسان بطور فرد کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کا کردار غیر شخصیت پرستانہ ہے۔ اسلام ان خصوصیات کو تسلیم کروانے کی جدوجہد نہیں کرتا جو انسانی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہیں۔ اسلام نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ انسان فرشتے بن جائیں کیونکہ یہ غیر ضروری ہے۔ اسلام نے تو ہمیں وہ بنانے کی کوشش کی ہے جو ہم ہیں یعنی انسان۔ ترکِ دنیا سے واقف ہونے کے باوجود اسلام نے کبھی انسانی زندگی صحت، ذہن، معاشرت، تمناؤں اور مسرتوں کو تباہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ترکِ دنیا کا ایک حد تک درجہ تو ہے تاکہ ہماری خواہشات کو حدود میں رکھا جائے اور ہمارے جسم و روح کے درمیان ایک توازن قائم کردیا جائے اور ہماری حیوانی اور اخلاقی خواہشات کے درمیان عدل قائم کردیا جائے۔ وضو، نماز، روزہ، جماعت، سرگرمی، مشاہدے، جدوجہد اور غور وفکر کے ذریعے اسلام انسان کو اجازت دیتا ہے کہ وہ فطرت کو اپنا کام کرنے دے، فطرت کی مخالفت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ سلسلہ تو اس وقت بھی چلتا رہتا ہے جب اہداف یکساں نہ بھی ہوں۔[۵۰]

اگرچہ دین اسلام کا یہ وہ رویہ ہے جس نے دوسرے گروہ کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا کردی ہیں اور وہ آج تک باقی ہیں۔ کچھ لوگوں نے اسلام پر نظری حملے کیے۔ اس کی ظاہری دنیا پرستی کو ہدف تنقید بنایا اور اس کے ذریعے قرآن کی آیات اور نبیؐ کی احادیث تک درج کیں۔ ہم صاف اور واضح الفاظ میں بیان کردینا چاہتے ہیں کہ ہاں، اسلام ایک فطری زندگی کی وکالت کرتا ہے اور ترکِ دنیا کا مخالف ہے۔ خوشحالی کے حق میں ہے اور غربت کے خلاف ہے۔ اسلام اس بات کے حق میں ہے کہ صرف اس سیارے پر ہی نہیں بلکہ ساری کائنات پر اسلام کا اقتدار پھیلا دیا جائے۔ لیکن اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ہمیں فطرت، خوشحالی، سیاست، سائنس، قوت اور علم پر بھی نگاہ ڈالنی چاہیے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس طریقہ کار سے ہٹ کر رائے عامہ اختیار کرنا چاہیے جو اہل مغرب نے اختیار کر رکھا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان تمام ذمہ داری خود قبول کرے۔ غربت، ترک دنیا، ایذا بخش زندگی کو اسلام معیاری زندگی قرار نہیں دیتا۔ یہ انسان کو زمین کا نمک اور بڑے نمکین سمندر کو چکھنے سے منع نہیں کرتا۔ اسلام ایک مکمل اور بھرپور زندگی کی تربیت دیتا ہے۔ اس زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو مسرت اور اختیار کی فطری خواہش ہے دوسرا اخلاقی کمال ہے جو فرد کی مستقل تخلیق ہے۔ یہ خواہشات صرف

۴۹۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۳۰۳، ۳۰۴ ۵۰۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۳۰۶، ۳۰۷

منطق وفلسفہ میں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں لیکن عملی زندگی میں یہ دونوں صورتوں میں ہوتا ہے۔ یہ امکان صرف اور صرف انسان کو دیا گیا ہے اور وہی اس کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔۵۱

اسلامی معاشرتی کردار

مردوں اور عورتوں کے درمیان کشمکش کا آغاز شادی کے بعد پیدا ہونے والے مسائل مثلاً ملک کی تقسیم وغیرہ سے ہوا۔ ذرائع پیدا وار کو عوامی ملکیت میں دینے کے بعد واحد خاندان معاشرے کی اقتصادی وحدت نہ بنا رہا۔ خانہ داری، سماجی صنعت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ بچوں کی نگرانی اور تعلیم ایک قومی معاملہ بن جاتا ہے۔ معاشرہ تمام انسانوں کی طرف سے ایک ہی رویہ اختیار کرتا ہے' چاہے وہ بچے جائز طور پر پیدا ہوتے ہوں یا ناجائز طور پر۔ یہ چیز نتائج گناہ کی فکر سے نجات دیتی ہے اور یہ فکر آج کے دور کا سب سے بڑا سماجی، اخلاقی اور اقتصادی مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یہی فکر ایک لڑکی کو اس بات سے روکتی ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس شخص کے حوالے نہ کرے جس سے وہ محبت کرتی ہے۔ کیا یہ چیز زیادہ مناسب نہ ہوگی کہ قید اختلاط کو بتدریج پروان چڑھایا جائے اور اس کے ساتھ زیادہ باشعور عوام پیدا کی جائے جو کنواری کی عظمت اور عورتوں کی حیا کو سمجھ سکے۔

عیسائیت کے دنیا کے بارے میں نظریے اور اس کے حیا کے بارے میں نظریے میں ایک واضح تعلق موجود ہے۔ مغرب میں مادہ پرستانہ سوچ سے اتفاق رکھنے والے ایسے اہل علم موجود ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ردعمل کے معاشی نظاموں اور جنسی عمل میں ایک تعلق ہے۔ ''ولہم رغ، ٹرانسکی اور فرینکفرٹ سکول کا تعلق اپنے انہی نظریات والوں سے ہے۔ ہربرٹ مرکیوس کہتا ہے کہ سرمایہ داری انسان کی جنسی قوت کو دبا دیتی ہے تا آنکہ اس کی جنسی قوت کو دوسرے میدانوں میں استعمال کیا جاسکے۔ مجرد ذریعے کی تصور کی بنیاد نہ تو خدا کے احکامات پر مبنی ہے نہ کلیسا کی اولین روایت ہی میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ تاہم شادی نہ کرنا مادہ پرستانہ ثقافت کا ایک فطری عنصر ہے۔ آخری ویٹی کن اجلاس میں یہ کوشش ابتدا سے ہی ناکام ہوگئی۔ حقیقت میں ان اصولوں کو مکمل طور پر کبھی بھی سمجھا نہ جاسکا۔ انتہائی محدود لوگوں کی مختصر سی تعداد ترکِ دنیا اور ترکِ ازدواج پر یقین رکھتی ہے' جبکہ سوویت یونین میں جنسی آزادی کے منفی تجربے کے بعد شادی کے ادارے کو از سر نو شروع کیا گیا۔۵۲

اسلامی ازدواج میں ان دونوں قسم کی شادیوں کو یکجا کردیا۔ یورپی نقطۂ نظر سے اسلامی شادی مذہبی اور معاشرتی مظہر ہے۔ یہ بیک وقت سماجی بھی ہے اور مذہبی اور روایتی بھی ہے۔ یہ رسم مولوی صاحب کی موجودگی میں ادا کی جاتی ہے اور وہ حکومت کا نمائندہ بھی ہوتا ہے۔ اسلامی شادی کو توڑا بھی جاسکتا ہے کیونکہ یہ ایک معاہدہ ہے۔ لیکن طلاق کی اجازت بھی اسی وقت ہوگی جب اس کے لیے مضبوط دلائل موجود ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ اس سے اسلام کی اخلاقی اور مذہبی تعلیمات کا اندازہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ اس لیے شادی ایک نمونے کا اسلامی ادارہ ہے۔ اسلام میں شادی کا ادارہ اس سوال کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کس طرح انسان کی

۵۱۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش، ص: ۳۰۷، ۳۰۸ ۵۲۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش ص: ۳۶۱، ۳۶۳

روحانی اور جسمانی ضروریات کا حل پیش کیا جائے۔ محبت کا انکار کیے بغیر بقا کے راستے پر کس طرح چلا جائے اور ایسے جانور کی صنفی خواہش کو کس طرح قابو میں لایا جائے جو فرشتہ تو نہیں بن سکتا تاہم آدمی تو بن سکتا ہے۔ یہ بلند نصب العین خالصتاً اسلامی ہے۔

شادی کو انصاف پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ ادارہ مسیحیت کے اقدامات کی نسبت زیادہ حق اور سچائی فراہم کرسکتا ہے کیونکہ مسیحیت نے پاکبازی اور عالمگیر محبت کا نعرہ دیا ہے۔

ٹالسٹائی نے تمام حقائق کو سمجھا لیکن اس سے نتائج بالکل متضاد اخذ کیے۔ وہ لکھتا ہے کہ چونکہ خالصتاً مسیحی تعلیمات میں شادی کے ادارے کی کوئی بنیاد نہیں ہے اس لیے ہماری مسیحی دنیا کے لوگ اس تعلق کو دریافت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ادارہ اپنی نوعیت کے ساتھ خالص مسیحی ہے۔ یہ مسیح کی مثالی زندگی کی طرف نہیں دیکھتے جو صنفی پاکیزگی کی مثال ہے اور موجودہ عقیدے میں اس کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ وہ قومیں جن کی اخلاقی تعلیمات کسی درجے میں عیسائیت کی تعلیمات سے فروتر ہیں ان میں قحبہ گری اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے اور ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کے رجحان کی انہی پابندیوں کے سبب بہت سی داشتائیں اور بہت سے مردوں کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کا طویل رجحان ہو رہا ہے۔۵۳

اینگلوسیکسن دنیا اور اسلامی نظام

یورپ نے اپنے بنیادی تصورات قرون وسطیٰ کے ابتدائی مدرسوں سے اخذ کیے۔ دور طفولیت کے یہ تجربات یورپی ذہن سے ابھی تک محو نہیں ہو سکے ہیں۔ اگرچہ یورپ کا ذہن بلوغت کو پہنچ چکا ہے۔ معاملات مذہبی ہوں یا غیر مذہبی' یورپ ہمیشہ مسیحی متبادلوں کے درمیان سوچے گا، چاہے خدا کی بادشاہی ہو یا زمین کی بادشاہی ہو۔۵۴

مغربی دنیا کا ایک حصہ اپنی جغرافیائی پوزیشن اور تاریخ کے باوجود قرون وسطیٰ کی نصرانیت اور اس کے طاقتور دور کے براہِ راست اثرات سے محفوظ رہا ہے۔ یورپ کے ایک حصے نے ایک درمیانی راستے کی تلاش جاری رکھی ہے جو ظاہری طور پر تیسرے راستے یعنی اسلام سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہاں اس وقت برطانیہ مراد ہے۔ لیکن بڑی حد تک یہ اینگلوسیکسن دنیا اس میں شامل کی جاسکتی ہے۔۵۵

مغربی دنیا کا ایک حصہ اپنی جغرافیہ

درمیانی راستے سوچ پر یقین رکھنے والے لوگوں کے درمیان ایک ممتاز نام 'آدم سمتھ' کا ہے۔ جس نے دو کتابیں لکھیں جو بظاہر تو مختلف نظر آتی ہیں مگر عملاً یکساں ہیں۔

اس کی پہلی کتاب A Theory of Moral Sentiments جبکہ دوسری An Inquiry into the nature and Causes of the Wealth of nations کو اٹھارویں صدی کی انتہائی پرتاثیر کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پہلی کتاب میں اخلاقیات کے اصول ہمدردی کو نقطہ آغاز قرار دیا اور دوسری کتاب میں سماجی اقتصادیات کو درج کرتے

۵۳۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش ص:۳۶۳، ۳۶۵ ۵۴۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش ص:۳۷۱

۵۵۔ ایضاً

ہوئے خود پرستی کے اصول کو آگے بڑھایا۔ یہ چیز ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ کتابیں اختلاف پر مبنی ہیں لیکن یہ بات درست نہیں۔ کیونکہ گلاسکو یونیورسٹی کے پروفیسر 'سمتھ' کا خیال ہے کہ اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات فلسفہ کے ایک مضبوط نصاب کے اجزا ہیں۔۵۶

بغیر کسی شک و شبہہ کے دو انتہاؤں کو اکٹھا کرنے کی ایک منضبط کوشش برٹرینڈ رسل نے کی' جس نے کہا کہ ایک اطمینان بخش اور پائیدار سماجی نظام کے مسئلے کا حل یہ نکالا جاسکتا ہے کہ رومی سلطنتوں کے اصولوں اور سینٹ آگسٹن کے تصور 'خدا کے شہر' کو ملا دیا جائے۔

اس سوال پر بحث کرتے ہوئے کہ جہاں کی تخلیق نو میں خیالات مرکزی کردار ادا کرتے ہیں' یا اس کے برعکس بات ہے۔ وہ کہتا ہے میرے نزدیک سچائی ان دو انتہاؤں کی درمیان موجود ہے۔ خیالات اور عملی زندگی کے درمیان ایک باہمی تعامل ہے۔۵۷

عصری تہذیبی چیلنجز کا اسلامی حل

فطرت کا راستہ طے شدہ ہے جبکہ انسان اپنی منزل کا تعین خود کرتا ہے۔ اس تقدیر کو قبول کر لینا ہی اسلام کا اعلیٰ ترین اور بہترین تصور ہے۔۵۸

اسلام دنیا کی تربیت کی بنیاد نشو ونما، تعلیم اور قوانین پر رکھتا ہے۔ یہ اس کا محدود پہلو ہے۔ خدا کے آگے جھک جانا اور خدا کی رضا اس کا وسیع تر پہلو ہے۔۵۹

مسائل کے حل کی طرف اسلامی رہنمائی کے سلسلے میں مصنف اس طرح لکھتے ہیں:

> ''مسئلے کے حل کے دو راستے ہیں۔ خدا کی اطاعت یا خدا سے بغاوت۔ خدا کی اطاعت میں انسانی ذہانت کے تمام پہلو شامل ہیں، سوائے ایک پہلو کے۔ وہ ہے کھوکھلی رجائیتِ اطاعت انسان کی تقدیر اور منزل کی کہانی ہے اور اس کی امید کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے کیونکہ ہر تقدیر نا مناسب اور ڈرامائی بن جاتی ہے۔ اگر ہم کو سب سے آخر میں جگہ ملے۔''۶۰

الغرض مصنف اس بات کو مکمل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس لیے اگر ہم دنیا میں اپنے مقام کو صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ خدا کی اطاعت اختیار کرلیں اور اس طرح امن وسلامتی کے حصار میں آجائیں۔ ہماری جدوجہد کا رخ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ہر چیز کو گھیر لیں گے اور ہر چیز پر قابو پالیں گے بلکہ یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہم اپنی پیدائش اپنے حالات اور اپنے دور کو سمجھیں اور اس وقت اور اس زمانے کو سمجھیں جس میں ہم خدا کی رضا سے زندگی گزار رہے ہیں۔ زندگی کی نارسائیوں کا ایک ہی بہترین اور صحیح حل ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کی کامل اطاعت قبول کرلی جائے۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے کہ جس میں بغاوت، نا امیدی اور خودکشی

۵۶۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش ص:۳۷۶، ۳۷۷

۵۷۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش ص:۳۸۰

۵۸۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش ص:۳۹۱

۵۹۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش ص:۳۹۲

۶۰۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش ص:۳۹۳

نہیں ہے۔ یہ ایک مثالی جذبہ ہے ایک پیروکار نہیں بلکہ ایک عام فرد کا ہے۔ جس نے اپنا فرض سرانجام دے دیا ہے اور اپنی قسمت کو بھی تسلیم کرلیا ہے۔ اسلام کا نام اس کے قوانین ممنوعات اور احکامات سے اخذ نہیں کیا گیا ہے نہ ہی جسم و روح کی قوتوں سے یہ اخذ کیا گیا ہے، بلکہ اسلام تو ان تمام امور کا احاطہ کرتا ہے اور ان سب سے بلند ہے۔[۶۱]

۶۱۔ اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش ص:۳۹۵